سندھ یونیورسٹی ___ علم کا ایک نیا گہوارہ

(سندھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی کی ایک یادگار تحریر)

[''مادرِ علمی سندھ یونیورسٹی،'' پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج'' کے بعد پاکستان کی دوسری قدیم یونیورسٹی ہے۔ درس و تدریس کے علاوہ علمی، ادبی اور سائنسی تحقیق کے حوالے سے اس کی خدمات پاکستان کی کئی جامعات کے مقابلے میں نمایاں قرار دی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جدید سندھ کی تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ میں بھی اسے نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس جامعہ کی ان فتوحات کا سبب یہ ہے کہ اسے ابتداء ہی سے نہایت تجربے کار، تعلیمی شعبے کے ماہر، مخلص اور دیانت دار وائس چانسلرز کی خدمات حاصل رہیں۔

یہاں ہم اسی جامعہ کے ایک قابلِ ذکر وائس چانسلر ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی مرحوم کا ایک ایسا خطبہ آپ صاحبانِ علم کی نذر کر رہے ہیں جو انھوں نے ''کل پاکستان تعلیماتِ اسلامی کانفرنس'' ۱۲ تا ۱۴ جنوری ۱۹۶۳ء کے موقعے پر سندھ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ یہی خطبہ کانفرنس کے موقعے پر شائع ہونے والے مجلّے ''ارمغان بہ یادگارِ جشنِ کل پاکستان تعلیماتِ اسلامی کانفرنس ۱۹۶۳ء، ''سندھ یونیورسٹی''، حیدرآباد میں شائع ہوا۔

اس خطبے کی افادیت یہ ہے کہ اس میں ایسی اہم معلومات شامل ہیں، جن سے نہ صرف سندھ یونیورسٹی کے قیام کے مقاصد پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اس عظیم درس گاہ کی ابتدائی تاریخ سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں سندھ یونیورسٹی پر لکھی جانے والی یہ پہلی قابلِ ذکر تحریر ہے۔ اور ایسے مدبر اور عالم فاضل کی یادگار ہے جو ادب اور سائنس دونوں میدانوں میں اپنی مثال آپ تھا۔ مدیر]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے اس علاقے میں جو سابقہ صوبۂ سندھ (ملک میں ون یونٹ قائم تھا) پر مشتمل ہے تعلیم کی حالت ناگفتہ بہ تھی[۲] اور مسلمانوں کو، جو یہاں پر غالب اکثریت میں تھے، اس ابتری کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ ان کی معاشی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ نجی تعلیمی ادارے کافی تعداد میں قائم کر سکتے۔

حالاں کہ سندھ کا صوبہ بمبئی پریسیڈنسی سے ۱۹۳۵ء میں الگ کیا گیا، لیکن چند ہائی اسکول اور تقریباً نصف درجن کالج جو موجود تھے، قیامِ پاکستان تک ''بمبئی یونیورسٹی'' کے زیرِ انتظام تھے۔

جو لوگ اخراجات برداشت کر سکتے تھے ان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے دور دراز جگہوں پر، جیسے علی گڑھ یا یورپ، جانا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ حالات تشفی بخش نہ تھے اور یہ عام طور سے محسوس کیا جاتا تھا کہ جب تک صوبے کے پاس اپنی یونیورسٹی نہ ہو، یہاں کے لوگ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں پیچھے رہیں گے اور جس کے نتیجے میں ان کے لیے دوسرے میدانوں میں بھی رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔

اس سے قبل اس طرف کچھ اچھی کوششیں کی گئیں مگر اس تحریک کو ۱۹۴۳ء میں اس وقت زیادہ قوت ملی جب قائدِ اعظم نے ''مسلم لیگ'' کی ایک تعلیمی کمیٹی کا تقرر کیا۔ جس سے یہ کہا گیا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت کے بارے میں رپورٹ پیش کرے اور اس میں ضروری اصلاح اور درستی کے لیے سفارش کرے۔

اس کمیٹی کی بڑی سفارشوں میں سے ایک سفارش یہ بھی تھی کہ سندھ کے صوبے میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس سفارش کے بعد اس تجویز پر کام شروع ہوا اور اس کو صوبائی اسمبلی سے پاس کرایا گیا۔ یونیورسٹی ایکٹ کو گورنر کی منظوری حاصل ہوئی اور (یہ ایکٹ) ۳ر اپریل ۱۹۴۷ء کو سندھ گورنمنٹ گزٹ میں چھپا۔ اس طرح سے یونیورسٹی کا قائم ہونا اور پاکستان کی پیدائش ساتھ ساتھ ہوئی۔

یونیورسٹی نے کراچی میں اپنا کام شروع کیا[۳]۔ پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم صاحب[۴] اس کے پہلے وائس چانسلر (۲۷ر اپریل ۱۹۴۷ء تا ۲۳ر مارچ ۱۹۵۱ء) تھے۔ ابتدائی کام بہت ہی ہنگامی فضا میں، جو تقسیم کے وقت تھی، کرنا پڑا اور وہ سب لوگ جو اس وقت اس سے متعلق تھے، اس کام کو شروع کرنے اور اس کو تقسیم کے بعد کے طوفان میں جاری رکھنے کے لیے خصوصی اعترافِ خدمات کے مستحق ہیں۔

ابتدائی کام

اس ابتدائی مرحلے میں یونیورسٹی کا کام قدرتی طور پر الحاق اور امتحان تک محدود تھا۔ اور پڑھانے کا کام پورے طور پر وہ چند ہائی اسکول اور کالج کرتے تھے جن کو نجی ادارے چلا رہے تھے۔

۱۹۵۰ء کے آخر میں مرکزی حکومت نے وفاقی دارالحکومت (پاکستان کا پہلا دارالحکومت ''کراچی'' تھا۔) کے لیے ''کراچی یونیورسٹی'' قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کی وجہ سے یہ ضروری ہوگیا کہ ''سندھ یونیورسٹی'' کو حیدرآباد منتقل کردیا جائے۔ علامہ۔ آئی۔ آئی قاضی ۵ کا تقرر وائس چانسلر کی حیثیت سے (۹) اپریل ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ انھوں نے یونیورسٹی کی ترقی کے لیے عظیم اساسی کام کیا اور (۲۵ مئی) ۱۹۵۹ء تک، جب کہ انھوں نے خرابیِ صحت کی بنا پر چارج چھوڑا، یونیورسٹی کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ مئی ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی کے دفاتر حیدرآباد شہر میں اس کی موجودہ عمارت ۶ میں منتقل ہوئے۔

اس کام کے ساتھ ساتھ یہ بھی طے ہوا کہ یونیورسٹی کو اپنا کام صرف الحاق اور امتحان تک محدود نہ رکھنا چاہیے بلکہ آنرس اور پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لیے تعلیمی شعبے بھی کھولنے چاہییں۔ چند سالوں کے دوران تقریباً پندرہ تعلیمی شعبے ''معاشرتی علوم''، ''تعلیم'' وغیرہ کی فیکلٹیوں میں کھولے گئے اور سات تعلیمی شعبے ''سائنس'' کی فیکلٹی میں کھولے گئے۔ ۷

علم کی ان شاخوں میں جن کو یہ شعبے پڑھاتے ہیں وہ بنیادی مضامین شامل ہیں، جو ہر یونیورسٹی میں پڑھائے جاتے ہیں اور جن کے آنرس، ماسٹرس، اور ڈاکٹرس کے درجے ہر یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ پاس ڈگری کے درجے الحاق شدہ کالجوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ جب یونیورسٹی ۱۹۵۱ء میں حیدرآباد منتقل ہوئی اور کراچی کے کالج اس کے دائرۂ اختیار سے جدا کر لیے گئے، تو یونیورسٹی کے احاطۂ اختیار میں صرف دو یا تین ڈگری کالج رہ گئے۔

فوراً ہی حکام نے اور لوگوں نے نجی اور گورنمنٹ کالج ہر ضلع میں کھولنے کی ایک جان دار تحریک شروع کی جس کے نتیجے میں اب تک تقریباً بیس ڈگری کالج اور اس سے کہیں زیادہ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالج سارے ریجن میں قائم کیے گئے۔ اس کے علاوہ اور زیادہ اسکول اور کالج کھولنے کا مطالبہ اب تک جاری ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ''سندھ یونیورسٹی'' کو پورے دو ڈویژنوں کے لیے، جو دس اضلاع پر مشتمل ہیں اور جن میں ساٹھ لاکھ سے زیادہ لوگ بستے ہیں، کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے تعجب خیز بات نہیں ہے کہ اس ریجن کو اور زیادہ تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے۔

میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے درجے گذشتہ سال (۱۹۶۲ء) یونیورسٹی کے دائرۂ اختیار سے الگ کر دیے گئے اور اسی سال ایک علیٰحدہ انٹرمیڈیٹ اور ثانوی تعلیم کا بورڈ قائم کیا گیا۔ ۸

جہاں تک پیشہ ورانہ مضامین کا تعلق ہے، جیسے ''طب'' اور ''زراعت''، یونیورسٹی کے دائرۂ اختیار

میں ''لیاقت میڈیکل کالج''، حیدرآباد۹ اور ''ایگری کلچر کالج''، ٹنڈو جام۱۰ اور بہت سے ''لاء'' اور ''کامرس'' کے کالج، حیدرآباد اور دوسرے ضلعوں میں ہیں۔ میڈیکل اور ایگری کلچر کالج کے اپنے اپنے کیمپس ہیں اور اساتذہ، عمارت اور ساز وسامان کے نقطۂ نظر سے وہ ملک کے دوسرے کالجوں سے پیچھے نہیں ہیں۔

ابتدائی اہم ضروریات

کسی تعلیمی ادارے کو کھولنے سے پہلے جن دو ضروری چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سامان اور اساتذہ ہیں۔ ملک کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح اس یونیورسٹی کو بھی، تقریباً ہر شعبے میں مناسب پڑھے لکھے اور تجربے کار اساتذہ کے فقدان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ابتدا میں یونیورسٹی مجبور تھی کہ ان لوگوں کا تقرر کرے جو دستیاب تھے اور جو ان حالات میں کام کرنے کے لیے تیار تھے۔ یونیورسٹی نے بہرحال اپنے چند طلباء کو اور نئے اساتذہ کو اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کے لیے باہر بھیجا۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ان حضرات کی واپسی کے ساتھ ساتھ حالات بتدریج بہتر ہو رہے ہیں۔

ایک سنگین دشواری جس کی وجہ سے یونیورسٹی کو ابتدائی مرحلے میں سخت نقصان اُٹھانا پڑا وہ مالی دشواری تھی۔ ابتداء کے چند سالوں میں اس کو صرف ایک لاکھ کی سالانہ گرانٹ ملتی تھی جو ۱۹۵۵ء میں پانچ لاکھ روپے تک بڑھا دی گئی۔ ظاہر ہے کہ یونیورسٹی اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار اساتذہ کو جو آنرس اور پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لیے ضروری تھے، کافی تنخواہ نہیں دے سکتی تھی۔ ۱۹۵۶ء سے گرانٹ بتدریج بڑھا دی گئی۔ گذشتہ سال صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے یونیورسٹی کو اپنے روزمرہ کے اخراجات اور توسیع کی اسکیموں کے لیے پچاس لاکھ سے زیادہ کی گرانٹ دی اور اس سال اس کو تقریباً پچھتر لاکھ کی گرانٹ اس کی مختلف ضرورتوں کے لیے ملی ہے۔

تنخواہ کے اسکیل

اس اضافے نے یونیورسٹی کے لیے یہ ممکن بنا دیا کہ وہ اپنے تنخواہوں کے اسکیل کو دوسری یونیورسٹی کے برابر کر دے۔ چنانچہ اس یونیورسٹی نے بہت سے باہر سے تعلیم یافتہ اور اعلیٰ ریسرچ کیے ہوئے اسکالرس رکھ لیے۔ حالات اب اتنے خراب نہیں ہیں جتنے کچھ عرصے پہلے تھے اور یہ اُمید کی جاتی ہے کہ اچھے رہائشی مکانات اور بہتر سہولتوں کے ہوتے ہی یونیورسٹی کو اچھے اسکالر کافی تعداد میں ملنے لگیں گے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یونیورسٹی نے اپنی ترقی اور تنظیم کے کام میں غیر ملکی ماہرین اور مشیروں سے کبھی کوئی مدد نہیں لی اور نہ وہ کسی غیر ملکی امدادی ادارے کے تعاون کے پروگرام سے متعلق رہی۔

یونیورسٹی اس بات کی پوری کوشش کرتی رہی ہے کہ جو بھی اس کے محدود انسانی اور مالی وسائل ہیں ان کا پوری طرح استعمال کرے۔

عمارت کے معاملے میں دونوں، رہائشی اور تعلیمی ضرورتوں کے لیے، یونیورسٹی کو ابتداء ہی سے سخت دشواریوں کا سامنا ہے۔ جب یونیورسٹی ۱۹۵۱ء میں کراچی سے حیدرآباد منتقل ہوئی تو اس کو صرف ایک اسکول کی عمارت اپنی تمام ضروریات کے لیے مل سکی جن میں پڑھانے، انتظام اور رہائش کی ضروریات شامل ہیں۔ [۱۱] وہ عارضی اقامت گاہ [۱۲] جو یونیورسٹی کو دی گئی تھی وہ بہت زیادہ ناکافی تھی اور چند عمارتوں کی تعمیر کے بعد بھی جگہ کی کمی کا شدید احساس ہونے لگا۔

۵۱-۱۹۵۰ء میں یونیورسٹی نے تقریباً سات ہزار ایکڑ زمین ''جام شورو'' میں حاصل کی۔ یہ زمین حیدرآباد سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور وہاں نئے اقامتی کیمپس کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اصلی منصوبے پر جو پہلے پانچ سالہ منصوبے کے لیے تیار کیا گیا تھا (تیرہ سال بعد) ۱۹۶۰ء میں نظرثانی کی گئی اور آخری منصوبے کو جس پر ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپیہ خرچ کا اندازہ ہے دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں شامل کیا گیا۔

جگہ کی سخت تنگی

پرانے کیمپس میں جگہ کی تنگی کو دور کرنے کے لیے اور تعلیمی شعبوں کو زیادہ جگہ فراہم کرنے کے لیے سائنس کے شعبوں کو نئے کیمپس میں منتقل کر دیا گیا ہے اور ایک ہاسٹل کا بھی انتظام کیا گیا ہے جس میں دوسو لڑکے رہ سکتے ہیں۔ اساتذہ کے لیے بھی رہائش کا بندوبست کیا گیا ہے۔

یہ ارادہ ہے کہ یونیورسٹی کو آگے چل کر بالکل اقامتی یونیورسٹی بنا دیا جائے۔ مگر چوں کہ طلبا کی کافی بڑی تعداد اب تک پرانے شہر (حیدرآباد) میں رہتی ہے اس لیے یونیورسٹی انھیں نئے کیمپس تک لانے کے لیے اپنی بسیں چلا رہی ہے۔ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ یونیورسٹی کے باقی شعبے آئندہ سال کے اختتام تک نئے کیمپس میں منتقل ہو جائیں گے۔ یونیورسٹی کی ترقی کا دوسرا مرحلہ تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے تحت انجام پائے گا۔

یہ اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ یونیورسٹی نے پہلے ہی سے آرٹس، سائنس اور تعلیم کی فیکلٹیوں کے بنیادی مضامین کو پڑھانے کا بندوبست کر رکھا ہے اور ان میں پاس، آنرس، ماسٹرس اور ڈاکٹرس کی ڈگری دیتی ہے اور اس کے الحاق شدہ کالجوں کے پاس طب، زراعت، قانون اور کامرس کے مضامین پڑھانے کا انتظام ہے۔

ایک اہم کمی

اب تک انجینئرنگ کالج کی عدم موجودگی ایک اہم کمی رہی ہے۔ یہ کمی اب دور کر دی گئی ہے اور اس کے لیے منصوبے مکمل کر کے منظور کر لیے گئے ہیں۔ یہ کالج، سول، میکینکل، الیکٹریکل اور ہر ایک انجینئرنگ

کی تعلیم دے گا[۱۳]۔ اس پر خرچ کا تخمینہ تقریباً ۲۳ (تیئیس) لاکھ روپیہ ہے۔ طلباء کی پہلی کلاس آئندہ سال انجینئرنگ کورس کے لیے شروع کی جائے گی اور اس اسکیم کے تکمیل پانے سے اس علاقے کے رہنے والوں کی بہت اہم ضرورتیں پوری ہوں گی۔ یونیورسٹی کے طالب علموں کو اب موقع ملے گا کہ وہ کوئی بھی بنیادی یا پیشہ ورانہ مضمون جس میں ان کا شوق اور رجحان ہو پڑھیں۔

اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ یونیورسٹی کو صرف اپنے کل وقتی طلبا ہی کا خیال نہ رکھنا چاہیے بلکہ پورے معاشرے کا خیال رکھنا چاہیے، یونیورسٹی نے حال ہی میں بہت سے پیشہ ورانہ مضامین کے لیے کئی ڈپلوما کورس شروع کیے ہیں۔ یہ ڈپلوما کورس ''آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس''، ''بزنس ایڈمنسٹریشن''، ''کوآپریشن''، ''سوشل ویلفیئر''، ''ووکیشنل گائڈینس''، ''فشریز''، ''اِسٹے ٹِس ٹکس'' وغیرہ ہیں[۱۴]۔ یہ کورس ان لوگوں کو مواقع فراہم کریں گے جو پہلے سے ملازمت میں ہیں تاکہ وہ اپنے کام کے متعلق تازہ معلومات حاصل کرسکیں اور زیادہ کامیاب ثابت ہوسکیں۔

لوگوں کی تمنا

ایک تمنا کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس علاقے کے رہنے والوں کو ایک ایسی یونیورسٹی ملنی چاہیے جو اُن کے خوابوں کی تعبیر ہو۔ یہ ایک ناممکن بات نہیں ہے اور اکثر خواب سچے ثابت ہوجاتے ہیں۔ مگر اس کے لیے کام کرنے کے جذبے اور قربانی کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے لیے جامع منصوبے بنائے جائیں اور قابلیت سے ان پر عمل کیا جائے اور دوسرے مفادات کو اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ اس راہ میں حائل ہوں۔

اگر تمنا مناسب ہے اور لوگ پورے خلوص سے اس کے لیے کام کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ یونیورسٹی اس ریجن میں علم کا گہوارہ نہ بن جائے، جو نہ صرف پرانی تہذیب کا گہوارہ ہے بلکہ اس برصغیر میں اسلامی دور کے آغاز کا نشان بھی ہے۔

حواشی

(۱) ''ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ۲۶ رمئی ۱۹۵۹ء سے ۲۷ رستمبر ۱۹۶۴ء تک سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ آپ ۲ رجنوری ۱۹۰۸ء کو حیدرآباد، دکن میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۵ء کے درمیان انھوں نے ''عثمانیہ یونیورسٹی'' حیدرآباد سے فرسٹ ڈویژن میں اعزاز کے ساتھ میٹرک، انٹرمیڈیٹ اور بی اے کرلیا تھا۔ اس کے بعد آپ کو یورپین اسکالرشپ دیا گیا۔ جس کی بنا پر ۱۹۲۸ء میں ''کیمبرج یونیورسٹی'' سے رضیات میں TRIPOS کی سند حاصل کی۔ اور پھر ۱۹۳۱ء میں

"لیپ رگ یونیورسٹی"، جرمن سے پی۔ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۴۲ء میں "عثمانیہ یونیورسٹی" نے اعلیٰ تعلیمی اور تحقیقی کاموں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری عطا کی۔اس کے علاوہ آپ کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ کوٹم مکینک کے نظریے پر کتاب لکھنے پر آپ کو ۱۹۳۸ء میں نوبل پرائز کے لیے نامزد کیا گیا۔اور آپ کو یہ منفرد اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ نے پروفیسر ہائزن برگ اور سائنس کی دنیا کے نامور پروفیسر آئن اسٹائن کے ساتھ کام کیا ان کے علاوہ ہندوستان کے ممتاز ترین سائنس دانوں کے ساتھ بھی تحقیقی کام کیے۔ان میں سر سی وی امن، کے ایس کرشنن، بیر بل ساہنی، ایچ جے بھابھا، این آر سین ڈی ٹی ڈی کوسبی، اور ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر وغیرہم شامل ہیں۔اس کے علاوہ مغربی دنیا کے ممتاز ترین سائنس دانوں سے ملنے تبادلۂ خیال کرنے، اُن کے لیکچر سننے کا موقع ملا اور ان کی موجودگی میں آپ نے ہارورڈ اور شکاگو کی یونیورسٹیوں میں لیکچر بھی دیے۔اسی دوران نامور پروفیسر Nleis Bhor سے خصوصی ملاقات کی اور اُن سے ایٹم کے تازہ ترین نظریے کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی نے بیرونی ممالک میں منعقدہ بے شمار کانفرنسوں میں سرکاری مندوب کی حیثیت سے شرکت کی اس کے علاوہ ہندوستان و پاکستان میں وہ جن عہدوں پر فائز رہے اُن کی فہرست بہت متاثر کن اور مرعوب کرنے والی ہے۔وہ ہندوستان کی سائنٹی فِک انجمنوں کے رکن یا صدر اُس وقت بھی منتخب ہوئے جب ہندوستان کی فضا فرقہ واریت کے بدترین زہر سے آلودہ تھی۔قیامِ پاکستان کے بعد بھی ہندوستانی سائنس دانوں نے انھیں کم از کم چھے مرتبہ اعزاز و امتیاز کے عہدوں پر منتخب کیا۔

بہر کیف ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ۱۹۳۴ء سے مرتے دم تک ملکی، غیر ملکی اور بین الاقوامی سائنس سوسائٹیوں کے صدر اور رکن رہے۔اس کے علاوہ ۱۹۵۳ء سے آخر وقت تک پاکستان اکیڈمی آف سائنس کے بانی سیکریٹری اور سیکریٹری جنرل رہے۔آپ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۰ء تک علی گڑھ یونیورسٹی کے اعزازی پروفیسر رہے۔اس کے علاوہ آپ جن چار جامعات کے وائس چانسلر رہے ان میں عثمانیہ یونیورسٹی بھارت (جہاں آپ شاگرد بھی رہے) پشاور یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی اور قائداعظم یونیورسٹی شامل ہیں۔۔آپ کو قائدِ اعظم یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔اس کے علاوہ ان جامعات میں سے پشاور یونیورسٹی اور قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد نے انھیں پروفیسر ایمریطس کے عہدے سے بھی نوازا۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی بے مثال سائنسی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۶۰ء میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے "آڈر آف میرٹ" عطا کیا۔۱۹۶۲ء میں وفاقی جمہوریہ جرمنی کے صدر نے جرمن ایوارڈ "Grosse Verdienst Kreuz" سے سرفراز کیا اور ۱۹۸۱ء میں جنرل محمد ضیاء الحق نے "ہلالِ امتیاز" سے نوازا۔

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی علم و فضل کی روشن اور تابندہ مثال ہیں۔آپ نے سائنس اور ادب دونوں میدانوں میں نام روشن کیا۔جہاں تک لسانی استعداد کی بات ہے تو آپ اُردو، عربی، فارسی، انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔اُردو ادب کے حوالے سے آپ ادبی تحقیق کے اُصول اور مسائل کے علاوہ اقبالیات اور ادبی تحریکات وغیرہم پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔انھیں غیر معمولی خوبیوں کی بناء پر آپ کے تحقیقی و تنقیدی کام قدر کی نگاہ

سے دیکھے جاتے ہیں ___ آپ نے ۲ جنوری ۱۹۹۸ء بمطابق ۱۳ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ بروز جمعہ ۹۰ سال کی عمر میں اسلام آباد میں انتقال کیا۔ شمیم صہبائی متھراوی نے قطعہ تاریخ وفات کہا:

رضی الدین صدیقی جو اِک تعلیمی رہبر تھے
بنے حکمِ خدا سے مالکِ خلدِ خدا ، لکھ دے
اگر چاہیے شمیم ان کے لیے تاریخ رحلت کی
رضی الدین صدیقی ہوئے از بس جدا ، لکھ دے

۱۴۱۸ھ

[ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی سے متعلق زیادہ تر معلومات ریڈیو کا رسالہ ''آہنگ'' (شمارہ یکم اگست تا ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء) میں شائع ہونے والے قومی دستاویزی پروگرام ''روشن مثال'' کی روداد مرتبہ صفدر ہمدانی سے حاصل کی گئی ہیں اس کے علاوہ ڈاکٹر نظیر صدیقی کے مضمون ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔ ایک اقبال شناس (مطبوعہ ''قومی زبان''، کراچی، شمارہ اپریل ۲۰۰۰ء) اور ماہ نامہ ''قومی زبان''، کراچی، مارچ ۱۹۹۹ء صفحہ ۷۷ سے مستفاد ہیں۔

(۲) تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ (۱) ''رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو ایجوکیشنل کانفرنس''، کراچی، ۱۹۰۷ء۔ مرتبہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ، ۱۹۰۸ء۔ (۲) حالی کا صدارتی خطبہ مشمولہ ''کلیاتِ نثر حالی''، جلد دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء، ص ۱۴۱۔ (۳) ''الطاف حسین حالی کراچی میں'' از مظہر یوسف، مشمولہ مجلّہ ''پرکھ''، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۷۸ء، ص ۲۸ تا ۱۱۲۔

(۳) ابتداء میں یہ یونیورسٹی کراچی میں ''این جے وی ہائی اسکول'' کی عمارت میں شروع ہوئی''۔ (''حیدرآباد''، از عشرت علی خاں، ص ۲۷۸) آج کل یہ عمارت ''اسمبلی بلڈنگ'' کہلاتی ہے۔

(۴) ممتاز ماہرِ تعلیم، مؤرخ، دانش ور، سندھ یونیورسٹی اور جامعہ کراچی کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر ابوبکر احمد حلیم، یکم مارچ ۱۸۹۷ء میں گیا (بہار) میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۰ اپریل ۱۹۷۵ء بروز اتوار کراچی میں انتقال کیا۔ آپ پاکستان آنے سے قبل مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے۔ شمیم صہبائی متھراوی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا:

جس سے گلہائے علم و فن مہکے
وہ بہارِ عظیم خُلد میں ہے
ملہمِ غیب نے شمیم کہا
پروفیسر حلیم خُلد میں ہے

۱۳۹۵ھ

(ماہ نامہ ''قومی زبان''، کراچی، جنوری ۱۹۷۶ء، ص ۱۳۸۔)

(۵) حضرت علامہ آئی آئی قاضی (امداد علی قاضی)، حیدرآباد کے مشہور عالم گھرانے سے تعلق، آپ کے والد امام علی قاضی خود بڑے دانش ور، علم و ادب دوست ہونے کے ساتھ ساتھ سرکارِ انگلشیہ کی جانب سے آنریری مجسٹریٹ کے

عہدے پر متمکن رہے۔ ان کے گھر واقع ''تھوڑا چاڑی'' (حیدرآباد) پر ادیبوں، شاعروں اور موسیقاروں کی بیٹھک رہتی تھی۔ ایسے ادبی ماحول میں علامہ آئی آئی قاضی نے ۱۸۸۶ء میں آنکھ کھولی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے تمام مدارج طے کیے۔۔۔علامہ نے نوکری حاصل کر کے کمالِ محنت سے خود کو سیشن جج کے عہدے پر پہنچایا۔ جو اُس دور میں بڑا عہدہ کہلاتا تھا۔ (آپ) انتظامی کونسل کے ہوم ممبر بھی رہے اور پھر ''سندھ یونیورسٹی'' کے وائس چانسلر کے عہدے سے مشرف ہوئے۔۔۔''آپ نے ۱۹۵۱ء سے لے کر ۱۹۵۹ء تک اس منصبِ جلیلہ پر رہ کر اس مادرِ علمی کو معیاری تعلیم گاہ بنانے کی تمام تر کوششیں کیں۔ علامہ بہت بڑے اسکالر، علم دوست، فلسفی اور ماہرِ تعلیم تھے۔ جس کا اظہار اُن کے خطوط سے بھی ہوتا ہے۔۔۔(آپ نے) ''شاہ جو رسالو'' پر تحقیقی کام کیا۔ آپ کی کتاب A "Browh girl in seareh of God مشہور ہے۔ علامہ کا انتقال ۱۳/اپریل، ۱۹۶۸ء کو ہوا''۔ (''حیدرآباد'' از عشرت علی خان، ص ۳۵۱۔) ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور قطعہ تاریخِ وفات بھی لکھا۔ یہی قطعہ علامہ کے کتبے پر بھی کندہ ہے۔ علاوہ ازیں اُن کے مقبرے کے لیے آرائشی آیات بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنی نگرانی میں تیار کرائیں۔

مخدوم و محترم علامہ امداد علی امام علی قاضی، بار ایٹ لا۔

گذشت افسوس ازیں دنیائے موہوم	بقیہ از سلف علامہ قاضی
تبحر داشت در معقول و منقول	تدبّر در قوانینِ سیاسی
مُبلّغ در علومِ دین و اخلاق	معلم در خلوص و دل نوازی
ز آثارش تصانیفِ عدیدہ	ز افکارش رموزِ حق شناسی
مزاجش نرم و نازک مثلِ گُل بود	کلامش متدل مانندِ رازیؒ
حیاتش صَرف شد در فکرِ قرآں	مماتش عبرت آموزِ جہانی
نہاں شد گنجِ علم و تاجِ دانش	بود در خُلد ایں علامہ قاضی
۱۳۸۸ھ	۱۹۶۸ء
۱۴محرم الحرام شنبہ	۱۳اپریل

(۶) سندھ یونیورسٹی، این جے وی ہائی اسکول، کراچی سے ''نیا ودیالہ اسکول'' (لیلسا قاضی کیمپس)، حیدرآباد میں منتقل ہوئی۔ (اس اسکول کی عمارت) رائے بہادر پربھ داس ولد شیوداس نے۔۔۔تعمیر کرائی، جو ۱۸۹۷ء میں بن کر مکمل ہوئی۔ اسے ہائی اسکول کا درجہ ۱۹۰۰ء میں ملا۔ اس عمارت کے ساتھ ایک چھوٹی عمارت ہاسٹل کے لیے بھی تھی۔۔۔ بمبئی کے گورنر سر جارج لائیڈ یہاں معائنے کے لیے آئے تھے اور گورنر لاسلاٹ گراہم نے بھی اس خوب صورت اسکول کا معائنہ کیا تھا۔

علامہ آئی آئی قاضی کے دور میں 'سندھ یونیورسٹی' نیو کیمپس، جام شورو منتقل ہوگئی۔ (نیو کیمپس اب ''علامہ آئی آئی قاضی کیمپس'' کہلاتا ہے۔ اور حیدرآباد میں واقع کیمپس کو 'علامہ آئی آئی قاضی کی اہلیہ کے نام پر ''لیلسا قاضی

کیمپس'' کہا جاتا ہے۔) ان دنوں یہاں یونیورسٹی کی کچھ کلاسوں (فیکلٹی آف ایجوکیشن) کے علاوہ ماڈل اسکول (ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، سندھ یونیورسٹی ماڈل اسکول) چل رہے ہیں۔ (''حیدرآباد'' از عشرت علی خاں، ص ۲۶۵۔)

(۷) شعبوں کے قیام کی تفصیل:

۵۲۔۱۹۵۱ء ــــ ۱۔ شعبۂ تعلیم ۲۔ شعبۂ تقابلِ ادیان و ثقافت اسلامی۔

۵۳۔۱۹۵۲ء ــــ ۱۔ شعبۂ تاریخ اسلام، ۲۔ شعبۂ عربی، ۳۔ سندھی شعبہ، ۴۔ شعبۂ اُردو، ۵۔ شعبۂ اقتصادیات، ۶۔ شعبۂ فلسفہ، ۷۔ شعبۂ فارسی،

۵۴۔۱۹۵۳ء: ۱۔ شعبۂ انگریزی، ۲۔ شعبۂ تاریخ عام، ۳۔ شعبۂ سیاسیات، ۴۔ شعبۂ نفسیات، ۵۔ شعبۂ ریاضی۔

۵۵۔۱۹۵۴ء ــــ شعبۂ نباتیات۔

۵۶۔۱۹۵۵ء ــــ ۱۔ شعبۂ حیوانیات، ۲۔ شعبۂ طبیعیات، ۳۔ شعبۂ کیمیا، ۴۔ شعبۂ جغرافیہ، ۵۔ شعبۂ تربیت امتحان سی۔ ایس۔ ایس (برائے مرکزی و صوبائی ملازمتِ اعلیٰ)، ۶۔ شعبۂ ریاضیات اور غیر نصابی سرگرمیاں۔

۵۷۔۱۹۵۶ء ــــ شعبۂ ارضیات۔

(ارمغان بہ یادگارِ جشنِ کل پاکستان تعلیماتِ اسلامی کانفرنس، ۱۹۶۳ء، ص ۴)

(۸) ''ایک زمانے میں میٹرک کے امتحانات سندھ بھر میں 'بمبئی یونیورسٹی' کے تحت لیے جاتے تھے۔ پھر پاکستان بننے کے بعد میٹرک اور انٹر کے امتحانات 'سندھ یونیورسٹی' کی زیرِ نگرانی منعقد ہونے لگے۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں ''بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کا قیام مٹھارام ہاسٹل میں جو بسنت ہال (حیدرآباد) کے برابر میں واقع ہے، عمل میں آیا ... (اس کی دوسری عمارت) کا سنگِ بنیاد اللہ بچایو آخوند نے ۱۹۶۷ء میں رکھا اور یہ خوب صورت عمارت ۱۹۶۸ء میں مکمل ہوئی جو لطیف آباد (حیدرآباد) نمبر ۹ میں واقع ہے۔ (''حیدرآباد''، از عشرت علی خاں، ص ۲۸۲۔)

(۹) ''۱۸۸۱ء میں انگریزوں نے ''سول ہسپتال'' (حیدرآباد) میں ''میڈیکل اسکول'' قائم کیا۔ جس کا الحاق ''بمبئی میڈیسن فیکلٹی'' سے تھا۔ واضح رہے کہ پہلے سندھ اور بمبئی ایک ہی صوبہ تھا۔ سندھ کی بمبئی سے علاحدگی کے لیے سندھ کے مسلمانوں نے تحریک چلائی۔ جس میں بالآخر انھیں کامیابی نصیب ہوئی اور اسے بمبئی سے الگ کر دیا گیا اور یوں سندھ میں ایک میڈیکل ادارے کی راہ ہموار ہوگئی چنانچہ ۱۹۴۵ء میں 'میڈیکل اسکول' کو کالج کا درجہ دے کر ... اس کا نام 'ڈاؤ میڈیکل کالج' رکھا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو 'ڈاؤ میڈیکل کالج' کو وفاق کی تحویل میں دے کر کراچی منتقل کر دیا گیا، اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں 'سول اسپتال' حیدرآباد کی موجودہ عمارت میں 'سندھ میڈیکل کالج' قائم کیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں 'سندھ میڈیکل کالج' کا نام بدل کر 'لیاقت میڈیکل کالج' رکھ دیا گیا۔ جو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم شہید نواب زادہ لیاقت علی خان کے نام پر رکھا گیا ... پھر اس کالج کو جام شورو منتقل کر دیا گیا''۔ (''حیدرآباد'' از عشرت علی خاں، ص ۲۷۹) ۲۰۰۳ء میں 'لیاقت میڈیکل کالج'' کو وسعت دے کر ''لیاقت یونیورسٹی میڈیکل اینڈ ہیلتھ سائنس'' کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

(۱۰) اب ''سندھ ایگری کلچر یونیورسٹی ٹنڈو جام''۔

(۱۱) ''نیا ودیالہ اسکول'' دو حصوں پر مشتمل تھا ایک حصہ درس و تدریس کے لیے اور دوسرا رہائش کے لیے۔ ''سندھ یونیورسٹی'' کے قیام کے بعد رہائشی حصے (نیا ودیالہ ہاسٹل) میں ''کلاسوں کا انتظام کیا جانے لگا اور آج کل اس میں فیکلٹی آف ایجوکیشن قائم ہے''۔ (حیدرآباد، ص ۱۶۷) ''شروع میں مشرقی حصے کو رہائش کے طور پر اور مغربی حصے کو دفتری امور کے لیے مخصوص کیا گیا۔ جب کہ جنوب مغربی حصے کو سائنسی بلاک کے طور پر استعمال کیا گیا''۔ (''حیدرآباد''، ص ۲۷۸) شعبۂ اُردو کے قدیم شاگرد بتاتے ہیں کہ ''شعبۂ اُردو'' ایک کمرے میں قائم تھا۔ جس کو دفتری اُمور کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا اور تدریس کے لیے بھی۔ جب طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو اکثر کلاسیں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے گھر پر بھی ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کا گھر کیمپس کے احاطے ہی میں واقع ہے۔

(۱۲) سندھ یونیورسٹی کو قیام کے وقت رہائش کے لیے دو جگہیں ملیں تھیں پہلی تو یونیورسٹی کے احاطے ہی میں تھی۔ جہاں صرف اساتذہ رہا کرتے تھے۔ جب کہ دوسری جگہ ''گرونگر'' حیدرآباد میں۔ یہ علاقہ ''آقندی ٹاؤن'' اور ''فقیر کا پڑ'' کے نزدیک ہے۔ یہاں اساتذہ کے علاوہ شاگرد بھی رہا کرتے تھے۔ آج کل یہاں ایک پرائمری اسکول ''عباس بھائی'' کے نام سے قائم ہے۔ عشرت علی خاں نے اس رہائشی عمارت کو ''سندھ یونیورسٹی ہاسٹل گرونگر'' لکھا ہے۔ (''حیدرآباد''، ص ۱۶۷)۔ بعد ازاں مہتھارام ہاسٹل بھی سندھ یونیورسٹی کی دسترس میں آ گیا۔

(۱۳) انجینئرنگ کی تعلیم دینے کی غرض سے ایک کالج ۱۹۶۳ء میں ''سندھ یونیورسٹی'' کے قانون کے تحت عمل میں لایا گیا۔ ۱۹۷۲ء کی تعلیمی پالیسی کے مطابق ۱۹۷۶ء میں اس کالج کو ''سندھ یونیورسٹی'' کا بڑا کیمپس ظاہر کیا گیا اور یکم مارچ ۱۹۷۷ء کو اسے ''انجینئرنگ یونیورسٹی'' کا درجہ دے کر اس کا نام ''مہران یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی'' رکھا گیا (''حیدرآباد''، ص ۲۸۰)۔

(۱۴) ان پیشہ ورانہ مضامین کو بین الاقوامی معیار کے مطابق پڑھانے کے لیے اب علاحدہ شعبے قائم ہو چکے ہیں۔ جن میں طلبا و طالبات کی ایک بہت بڑی تعداد زیرِ تعلیم ہے۔

کتابیات

۱۔ آفتاب احمد خان، صاحب زادہ: مرتب رپورٹ ''آل انڈیا محمڈن اینگلو ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، ۱۹۰۷ء''، علی گڑھ، انسٹی ٹیوٹ پریس، ۱۹۰۸ء۔

۲۔ حالی، الطاف حسین: ''کلیاتِ نثرِ حالی''، جلد دوم، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۸ء۔

۳۔ عشرت علی خان: ''حیدرآباد''، طبع اوّل، حیدرآباد، ادراک پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء۔

رسائل

۱۔ پندرہ روزہ ''آہنگ''، شمارہ یکم اگست تا ۱۵/اگست ۱۹۸۲ء۔

۲۔ شعبہ جاتی مجلّہ ''پرکھ''، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۱۹۷۸ء۔

۳۔ ماہ نامہ ''قومی زبان''، کراچی، شمارے: جنوری ۱۹۷۶ء، مارچ ۱۹۹۹ء، اپریل ۲۰۰۰ء۔